رشید حسن خاں۔ ایک منفرد محقق

پچھلی ربع صدی کے دوران ادبی تحقیق اور تحقیقی انتقادیات کے سلسلے میں جو چند اہم نام ابھر کر سامنے آئے ہیں ان میں رشید حسن خاں کا نام بروجوہ بہت نمایاں اور ممتاز ہے۔

رشید حسن خاں نے اگرچہ بعض اہم تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں لیکن بیشتر انھوں نے اپنے مخصوص علمی میلانات کے زیر اثر قلم اٹھایا ہے اور اپنے تحقیقی مطالعہ کے لیے کچھ مخصوص موضوعات کو منتخب کر لیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے علمی نقطۂ نظر اور طریق عیار گری کے مطابق کسی دوسرے درجے پر آ کر لکھنا نہیں چاہتے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ انھوں نے کم لکھا ہے۔

اردو املا رشید حسن خاں کے یہاں تحقیق و تجسس کا خاص موضوع رہا ہے۔ ان کا زاویۂ نگاہ بہت وقیع ہے۔ جو مسائل و مباحث گذشتہ ایک صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت میں سامنے آئے ہیں۔ رشید حسن خاں نے ان کا مطالعہ گہری نظر اور غیر معمولی دل چسپی کے ساتھ کیا ہے۔

اردو املا کی طرح زبان و قواعد کے مسائل بھی رشید حسن خاں کے لیے خصوصی توجہ اور علمی تحقیق و تجسس کے مستحق رہے ہیں۔ اردو کی صفوں میں ایسے قابلِ استناد افراد اب کم ہوتے جا رہے ہیں جو ان مسائل سے پوری واقفیت اور کما حقہ دل چسپی رکھتے ہوں اور ان پر اظہارِ خیال کے بجا طور پر اہل ہوں۔ رشید حسن خاں نے ان پیچیدہ اور سلسلہ در سلسلہ مسائل پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں اور خلاصۂ بحث کے طور پر اس اصول کو تسلیم کیا ہے کہ اردو زبان میں لفظوں کی تراش خراش اور صورت گری کے عمل کی کسوٹی "رواجِ عام" ہے اور اسی کو سند و برہان ماننا چاہیے۔

اس ضمن میں ان کے یہاں جو اہتمامِ تلاشِ جزئیات ملتا ہے، وہ زبان و قواعد کے مطالعے میں ان کی غیر معمولی تحقیق و تجسس کی نشان دہی کے لیے کافی ہے۔

رشید حسن خاں کا خاص موضوع ادبی تحقیق ہے۔ اپنی کتاب "ادبی تحقیق" میں انھوں نے اپنے تحقیقی مطالعے کے فکری نتائج اور ان سے استنباط کردہ اصول و نظریات کو پیش کیا ہے۔ رشید حسن خاں کے مضامین کا مجموعہ جو کتابی شکل میں سامنے آیا ہے، اردو زبان کی تحقیق و ادبیات میں بلاشبہہ ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ اسی کتاب میں وہ مضامین موجود ہیں جنھوں نے ہمیں "چونکایا" ہے اور اس کا بار بار احساس دلایا ہے کہ تحقیق کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔

رشید حسن خاں نے اس موضوع پر اپنی گفتگو بلکہ گفتگوؤں میں بار بار اس پر زور دیا ہے کہ تحقیق و تنقید سے

سے الگ ہے اور تنقیدی تعبیرات سے اس کا کوئی رشتہ نہیں یہ بات وہ غیر مبہم اور واشگاف پہنچے میں اس لیے کہنا چاہتے ہیں کہ آج کل دانش گاہوں میں "ریسرچ" کے نام پر ہر طرح کی ادبی کارگزاریوں کو "تحقیق" کے دائرے میں داخل کر لیا گیا ہے اور جس نوعیت کا کام اس عنوان سے کیا جا رہا ہے، وہ تحقیق اور تنقید دونوں کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اور اس سے خلطِ مبحث کے لیے بڑی گنجایشیں پیدا ہو گئی ہیں۔

تحقیق کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے لکھا:

"ادبی تحقیق میں کسی امر کا وجود بطور واقعہ اس صورت میں متعین ہوگا جب اصول تحقیق کے مطابق اس کے متعلق معلومات حاصل ہوں۔

واقعے کا چھوٹا یا بڑا ہونا، اہم یا غیر اہم ہونا ادبی تحقیق میں کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ صفاتی الفاظ صرف اس صورتِ حال کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں اس واقعے سے کام لیا جا رہا ہے۔

تحقیق ایک مسلسل عمل ہے۔ نئے واقعات کا علم ہوتا رہے گا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کون سی حقیقت کتنے پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔ اکثر صورتوں میں ہوتا یہ ہے کہ حجابات بہ تدریج اٹھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیق میں اصلیت کا تعین اس وقت تک کی حاصل شدہ معلومات پر مبنی ہوتا ہے۔ اس سے آیندہ کے امکانات کی نفی نہیں ہوتی لیکن محض آیندہ امکانات پر ان باتوں کو بطور واقعہ نہیں مانا جا سکتا جو اس وقت تک محض قیاس آرائی کا کرشمہ ہوں"[1]

اس ایک گونہ تفصیلی اظہارِ رائے کے ساتھ آخری جملے تک پہنچتے پہنچتے یہ بحث ایک نئے موضوع فکر و نظر سے جا ملتی ہے اور وہ یہ کہ تحقیق کو صرف واضح شہادت اور استخراجی نتائج تک محدود سمجھنا چاہیے۔ استقرائی سطح پر اخذ نتائج اور استنباط اس سے الگ "دید و دریافت" کا ایک عمل ہے جس کے دائرے میں تنقیدی فکر و فہم اور تعبیرات کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ رشید حسن خاں نے اس پہلو سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"تعبیرات کو واقعات نہیں کہا جا سکتا اور تحقیق کا مقصود حقائق کی دریافت ہے۔ اس لیے ایسے موضوعات جن میں تنقیدی تعبیرات کا عمل دخل ہو، تحقیق کے دائرے میں نہیں آتے۔ تنقیدی صداقت تنقیدی تعبیرات کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی مسئلے پر دو مختلف افراد دو مختلف رائیں رکھ سکتے ہیں جب کہ تحقیق میں اس طرح کے اختلاف کی گنجایش نہیں ہے"[2]

رشید حسن خاں کے نقطۂ نظر میں جو قطعیت ہے، اس کا تعلق تحقیق کی اس تعریف سے ہے جس میں واقعہ اور واقعیت کا تعین ان بدیہی شواہد اور استخراجی نتائج کے سخت کیا جاتا ہے جس کے بارے میں اختلافِ رائے کی گنجایش نہیں ہوتی۔ اس سے آگے اور الگ جو طریق رسائی موجود ہے اور جن وسائل تفہیم کا

سہارا لیا جاتا ہے ان کو غیر علمی تو نہیں کہا جا سکتا لیکن ان پر تحقیق اور تحقیقی طریق رسائی کا اطلاق بھی ممکن نہیں۔

اپنے نقطۂ نظر کی منطقی حدود میں زور دینے کے باوصف رشید حسن خاں کی نظر سے یہ نکتہ چھپا نہیں ہے کہ سادہ تحقیق کو خواہ اس کی بنیاد کتنے ہی مبہم اور ٹھوس حقائق پر ہو، اس وقت تک پُر معنی اور نتیجہ خیز نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ دوسرے حقائق اور مضمر سچائیوں سے اس کی معنویت کا رشتہ نہ قائم ہو جائے۔ ادبی صداقتوں کے ضمن میں اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ رشید حسن خاں جہاں اس کو ضروری سمجھتے ہیں کہ حقائق اور شواہد کا تعین تحقیق ہی کو کرنا چاہیے، وہاں انھوں نے اس سچائی کو بھی بغیر کسی تذبذب کے پیش کر دیا ہے کہ:

> تحقیق میں اعداد و شمار اور مطلق حقائق کا تعین بنیادی چیز ہے لیکن یہی سب کچھ نہیں۔ یہ اس کا ابتدائی حصہ ہے، بے حد ضروری لیکن اہم کام یہ بھی ہے کہ جن حقائق کا تعین کیا گیا ہے، دیکھا جائے کہ ان سے کیا نتائج نکلتے ہیں اور ان سے علم و آگہی میں کس نوعیت کا اضافہ ہوتا ہے [1]

ظاہر ہے کہ علمی حقائق کے "استنادی تعین"، اور بازیافت کے "مبنی بر حقائق" عمل کے بغیر اگر معنی آفرینی اور قیاس آرائی کی جائے گی تو وہ تعبیرات کا آرٹ تو ضرور ہوگا لیکن اس نوع کی رسائی فکر اور ذہنی اختراع کو "سندِ اعتبار" سے محروم تصور کیا جائے گا۔ اس لیے رشید حسن خاں کا یہ خیال بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ:

> "اب سے پہلے اس بات کا یقین دلانا مشکل تھا کہ تحقیق کے فراہم کیے ہوئے مواد، اس سے نکالے ہوئے نتائج اور اس سے متعین کیے ہوئے حقائق کو سامنے رکھنا نقید نگار کے لیے لازم ہوگا اور اس کے بغیر کچھ کہا جائے گا تو وہ قابل قبول نہیں ہوگا۔ حقائق اور شواہد کا تعین تحقیق ہی کرے گی اور ناقد کے لیے لازم ہوگا کہ وہ ان کو ملحوظ رکھے۔" [2]

تنقیدی فکر و فہم اگر علمی طریق رسائی اور حقائق و شواہد کے صحیح تعین سے دور نہ جا پڑے تو وہ بھی نکتہ رسی، حقیقت شناسی و معنی بینی کا ایک بڑا وسیلہ ہے مگر اس کے وہی فیصلے درخورِ اعتنا اور قابل اعتبار ہوں گے جو استخراجی نتائج پر مبنی ہوں۔ محض استقرائی مفروضات کا کرشمہ نہ ہوں۔

رشید حسن خاں اپنے فیصلوں میں کسی نوع کی لچک یا دو رنگی خارج از بحث خیال کرتے ہیں، وہ صرف اس رائے کو مانتے ہیں اور منوانا چاہتے ہیں جس کی استنادی حیثیت مسلّم ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ "ریسرچ"، اپنی حدود کا تعین کرے اور اُس سے آگے نہ جائے۔ چنانچہ انھوں نے لکھا ہے:

> "یہاں پر یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص کچھ معروضی حقائق یا شواہد کا تعین کر دیتا ہے اور اس سے آگے کچھ نہیں کرتا تو یہ بھی بجائے خود اہم ہے ایک دوسرا شخص جو استخراج نتائج کی زیادہ اچھی صلاحیت رکھتا ہے وہ اس سے فائدہ اٹھا کر دوسرے رخ کی تکمیل کرے گا۔ کبھی کبھی صلاحیتوں کی کمی بیشی کا فرق بھی بعض ناتمامیوں کا باعث ہوا کرتا ہے۔"

اس روشن اور شفاف انداز نظر کی مزید صراحت اس بیان میں سامنے آئی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ خود رشید حسن خاں کے یہاں تنقید اور تحقیق میں کوئی تضاد کا رشتہ نہیں بلکہ سچ پوچھیے تو تعامل اور تکمیل کا رشتہ ہے۔ انھوں نے اس بحث میں آگے چل کر یہ کہا ہے:

"استخراج نتائج کی طرف توجہ زیادہ مبذول ہونے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ سماجی اور سیاسی واقعات کے اثرات کی نشان دہی کی طرف بھی توجہ کی گئی اور سمجھا گیا کہ کسی مصنف کے ساتھ تنقیدی سطح پر انصاف کرنے کے لیے صرف اس کے ذاتی حالات سے واقفیت کافی نہیں وہ جس زمانے میں تھا اور اس کے گرد و پیش جو حالات چھائے ہوئے تھے اور وہ حالات جن خاص اسباب کا نتیجہ تھے ان کا بھی جائزہ لیا جائے۔ اس کے لیے سب سے پہلے خالص تحقیقی انداز سے سارے واقعات کا بالکل صحیح صحیح تعین کیا جائے۔ پھر تحقیق کی روشنی میں خالص منطقی انداز سے نتائج نکالے جائیں۔"

تحقیقی انداز نظر کے ساتھ واقعات کا تعین جتنا ضروری ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ اردو میں تحقیقی رسائل کا فقدان تو نہیں ہے لیکن دشواری یہ ہے کہ ایسے بہت سے وسائل منتشر ہیں اور ان کی وضاحتی فہرستیں بھی بیشتر صورتوں میں دستیاب نہیں۔ نئے مآخذ اور نو دریافت وسائل تک رسائی بہت سے افراد کے لیے یوں بھی ایک کار مشکل ہے۔ خاص طور پر ان کے لیے جو راہ تحقیق میں اوّل اوّل قدم رکھتے ہیں، تن آسانی محنت سے اعراض اور ذہنی کاہلی کی بات الگ رہی۔ تحقیقی تربیت کے لیے رہنما کتابوں کی کمی بھی ایک مسئلہ ہے۔ علاوہ بریں عام حالات میں جن مصادر تک پہنچنا ممکن ہے، صدق روایت اور صحت متن کے لحاظ سے ان پر بھی اعتماد مشکل ہے۔ جن مآخذ میں ادبی تحقیق میں بھروسا کیا جا سکتا ہے اور جنھیں بالعموم درجہ استناد دیا جا رہا ہے، وہ متنوع قلمی مآخذ بالخصوص تذکرے اور بیاضیں ہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ وہ بھی بہت سی صورتوں میں سند و برہان کے کام نہیں آ سکتیں اور یہ مسئلہ خود رشید حسن خاں نے اٹھایا ہے۔

اصولیات تحقیق کے سلسلہ میں رشید حسن خاں کا ایک اہم کارنامہ (جسے فی الجملہ ان کی اوّلیات میں شمار کیا جانا چاہیے) تذکروں اور بیاضوں پر ان کی تحقیقی گفتگو ہے جس میں انھوں نے ان مآخذ کی استنادی حیثیت پر "شک" کا اظہار کیا۔ اور اس مسئلے کو پہلی بار اہلِ علم اور اربابِ تحقیق کے سامنے رکھا ہے۔ اپنے مقالۂ تحقیق سے متعلق بعض مسائل میں انھوں نے اس طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا ہے۔

"بیشتر مطبوعہ تذکروں کے متن پر پوری طرح اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اکثر مطبوعہ تذکرے اس قدر غلط چھپے ہیں یا ان میں ایسی غلطیاں راہ پا گئی ہیں کہ ان کا از سر نو مرتب کیا جانا ضروری ہے۔ ان میں وہ تذکرے بھی شامل ہیں جن کو ایک زمانے میں انجمن ترقی اردو نے شائع کیا تھا اور وہ بھی جو اس زمانے میں بعض معروف حضرات کے مقدموں کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ ایسی صورت میں احتیاط کا تقاضا یہ ہوگا کہ امکان کی حد تک تذکروں کے اہم خطی نسخوں سے بھی استفادہ کیا جائے۔ بعض مطبوعہ تذکروں کے جو خطی نسخے اب ملے ہیں ان میں ایسے اضافے ہیں جن سے مطبوعہ تذکرے خالی ہیں۔"[1]

تذکروں پر یہ گفتگو ان اعتراضات سے بہ مراتب مختلف ہے جو گارساں دتاسی سے لے کر تا زمانۂ حال کیے جاتے رہے ہیں۔ یہاں تذکروں کی روایتی خامیوں کا ذکر نہیں، ان کی استنادی حیثیت کے تعین کا سوال ہے، جو ذہن کو ایک نئی سمتِ سفر دیتا ہے۔

انھوں نے بیاضوں کے حوالوں کو بھی مشکوک حوالوں کے ذیل میں رکھا ہے اور ان پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

> پرانی بیاضوں کا اچھا خاصا ذخیرہ مختلف کتب خانوں اور ذاتی ذخیروں میں محفوظ ہے۔ بیاض مرتب کرنے کا کوئی مقررہ طریقہ نہیں تھا۔ کسی مجموعے یا کسی دوسری بیاض سے بھی کلام نقل کیا جا سکتا تھا اور مختلف لوگوں کی زبان سے سن کر بھی شاملِ بیاض کیا جا سکتا تھا۔ اس میں صحت انتساب کی حیثیت ثانوی ہوا کرتی تھی، اصل چیز ہوتی تھی ذاتی پسندیدگی۔ ایسے مجموعوں کی اہمیت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کے مندرجات عمومی طور پر صحت متن اور صحت انتساب کے لحاظ سے تصدیق کے محتاج رہیں گے.....
>
> ایسی مجہول الاحوال بیاضوں سے استفادہ خاص طور پر احتیاط کا طلب گار رہے گا[۲]

بات بالکل صحیح ہے۔ صحت روایت، صحتِ انتساب اور صحتِ متن کا مسئلہ تحقیقی نقطۂ نظر سے کلیدی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس بحث کو اگر پھیلایا جائے تو بیشتر قلمی مآخذ اس کے دائرے میں آجائیں گے اور زیادہ صحیح طریقِ رسائی وہی ہوگا کہ معتبر غیر معتبر اور مشکوک کا فیصلہ کرنے میں احتیاط برتی جائے جس کے لیے رشید حسن خاں نے کہا ہے:

> "روزنامچوں اور بیاضوں کے اندراجات ہوں یا اس قسم کے دوسرے ذرائع، ان کا مطالعہ تو ضرور کرنا چاہیے، مگر بطورِ حوالہ ان کو قبول کرنے میں احتیاط اور زیادہ احتیاط کرنا چاہیے۔"

ایک اور اہم مسئلے پر رشید حسن خاں نے خصوصیت سے توجہ دلائی ہے، وہ اساسی مآخذ کے تراجم ہیں جو بدرجۂ مجبوری اساسی مآخذ کے ذیل میں آتے ہیں اور جن سے متعدد مواقع پر استفادہ ایک ناگزیر صورت ہوتا ہے:

> "اردو میں تحقیقی کام کرنے والوں کو جن مآخذ سے استفادہ کرنا پڑتا ہے، ان میں بیشتر فارسی میں ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی کتابوں خاص طور پر تذکروں کا اردو میں ترجمہ ہونا چاہیے۔ اس کا جواب بہت صاف اور واضح ہے کہ ترجمے کو اصل مآخذ کی حیثیت سے نہ پیش کیا جا سکتا ہے نہ کیا جانا چاہیے۔"

ظاہر ہے اس معاملے میں اصولی حیثیت سے دو رائیں نہیں ہو سکتیں لیکن اس سلسلے کی فنی دشواریاں ایسی بھی نہیں جنھیں ناقابلِ التفات قرار دیا جائے۔

رشید حسن خاں کے یہاں جو تحقیقی انداز نظر ملتا ہے وہ کافی دنوں سے احتساب کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ یوں بھی اردو میں تحقیق روایت نمایاں حیثیت سے "دو اہم مکاتب فکر" میں منقسم نظر آتی ہے ایک روایت ہے جس کے تحقیقی کارناموں کی امتیازی شکل میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور ڈاکٹر گیان چند جیسے محققین کے

ممتاز کارناموں میں ملتی ہے۔ یہ حضرات کسی دوسرے کام میں اعتراض یا احتساب کو اس وقت تک ضروری نہیں سمجھتے جب تک مقطع میں سخن گسترانہ بات نہ آپڑے۔ ان کا مطمح نظر اپنے ذاتی کاموں میں خوب سے خوب تر کی تلاش ہے اور بس۔

دوسری روایت جو اس کے مقابلہ میں آئی ہے، تحقیقی انتقاد کی وہ صورت ہے جس میں علمی کاموں کے تحقیقی جائزے اور "احتساب" کو ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ تاکہ غلطیوں کو فروغ پانے کا موقع نہ ملے اور تحقیقی کام کرنے والے اپنے علمی ذمّے داریوں کو فراموش نہ کریں۔ پروفیسر شیرانی اور قاضی عبدالودود جیسے اکابرین اسی دوسری روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔ رشید حسن خاں کا تعلق بھی اسی شکایت سے ہے۔ وہ بھی علمی احتساب اور تحقیقی عیارگیری کو ایک ناگزیر تقاضا خیال کرتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے:

> "ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں پہلے کے مقابلہ میں زیادہ صفائی اور زیادہ شدّت کے ساتھ احتساب کی ضرورت کو محسوس کیا گیا اور اس پر عمل بھی کیا گیا... اس لحاظ سے گویا تحقیق نے شیرانی صاحب کی روایت کو پھر سے زندہ کیا جنھوں نے سب سے پہلے تحقیق کی سچائی کو ساری وضع داروں، مروّتوں، مصلحتوں اور سخن گسترانہ اسالیب سے الگ رکھنے کی کوشش پر زور دیا تھا۔ اس زمانے میں قاضی عبدالودود نے اس کو پھر سے اور زیادہ اہتمام کے ساتھ زندگی نو بخشی۔"[1]

اس سے رشید حسن خاں کا تحقیقی مسلک واضح ہو جاتا ہے۔ انھوں نے اس کو اپناتے ہوئے ساری وضع داریوں، مروتوں اور مصلحتوں سے اپنے ناقدانہ رویّے کو الگ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی سب سے بہتر مثالیں اُن تحقیقی تبصروں میں سامنے آتی ہیں جو "علی گڑھ تاریخ ادب اردو"، "دیوان غالب"، مرتبہ مالک رام اور "تاریخ ادب اردو"، مؤلفہ جمیل جالبی پر کیے گئے ہیں۔ ان تبصروں نے پڑھنے والوں کو متوجہ کیا اور لکھنے والوں کو متنبہ کیا ہے اور تحقیقی نگارشوں میں احتیاط کے کیا معنی ہیں اس کی طرف بہت سے لوگوں کی نظر گئی ہے۔

تحقیق میں غلط فہمیوں اور غلط نگاریوں کی روک تھام ضروری ہے۔ اگر ہر طرح کے جذباتی رویوں اور غیر علمی فیصلوں کو برداشت کر لیا جائے تو راہ علم رفتہ رفتہ کانٹوں سے بھر جائے گی اور سہل نگاری عشق و عقیدت اور تنافر و تعصّب کے تحت روایتی معلومات اور مزعومات کا انبار بڑھتا چلا جائے گا جس طرح تنقید اچھے بُرے کی پرکھ اور ادب کی اقدار شناسی کے لیے ضروری ہے اسی طرح حقائق کی چھان بین کے لیے تحقیقی تجزیہ ایک ناگزیر صورت ہے جس کے بغیر معروضی سچائیوں کا تعیّن ممکن نہیں۔

یہ ایک دل چسپ حقیقت ہے کہ "زبان و قواعد" اور اردو املا جیسی کتابوں میں (جو یقیناً رشید حسن خاں کے وقیع علمی کارناموں میں سے ہیں) جو اندازِ نگارش ملتا ہے، اس کے مختارات بحث و تحریر میں شروع سے آخر تک وہی سنجیدہ اسلوب کارفرما ہے جس کی توقع وہ ایک محقق سے کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ میں ان کا رویّہ نمایاں طور پر بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کا آغاز بگمان غالب علی گڑھ تاریخ ادب پر ان کے تاریخی تبصرے سے ہوتا ہے۔

تحقیق اور اخلاقیاتِ تحقیق کے ضمن میں جو مضامین انھوں نے لکھے ہیں، ان کی افادیت واہمیت میں کلام کی گنجائش نہیں۔ ان مضامین کا اثر تحقیقی انداز پر مرتّب کی جانے والی کتابوں سے بھی کچھ زیادہ ہوا ہے لیکن جگہ جگہ ان کی زبان تحقیقی انداز بیان کے سادہ و سنجیدہ دائرے سے باہر آگئی ہے۔ اس سے گفتگو کا لطف بڑھ گیا ہے۔ چبھتے ہوئے فقرے یوں بھی زیادہ یاد رہ جاتے ہیں اور گرمی محفل کے کام آتے ہیں۔ یہاں ایسے بعض فقرے نقل کیے جاتے ہیں جو قوس و قزح کے نیم دائرے کی طرح زبان و بیان کے کچھ شوخ رنگوں کو تو واضح کرتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ ایک محقق کی زبان کی سطح سے کچھ الگ بھی ہیں:

"حالات کے زیر اثر تحقیق کو دانش گاہوں میں پناہ گزیں ہونا پڑا ہے۔ جب کہیں پناہ گزینوں کا سیلاب آتا ہے تو شہری زندگی میں بہت سے پریشان کن مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔"

"یہ ایسے عوامل ہیں کہ ان کا پھیلایا ہوا غبار زندگی میں ابہام کا دھندلکا پھیلائے رکھتا ہے۔"

"ایسے اداروں کا جو پنچایتی کام اب تک سامنے آیا ہے وہ معیار کے اعتبار سے مایوس کن ہے۔"

"اکثر سینیر اساتذہ کمیٹیوں کے ممبر بننے اور ترقی کے ہتھے کرنے میں اس قدر مصروف رہتے ہیں کہ لکھنے پڑھنے کے فالتو کاموں کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ (ان کا) طالب علم حیران و پریشان اِدھر اُدھر مدد کی بھیک مانگتا پھرتا ہے۔"

"ممتحنین کی طرف سے مقالے کے رد کیے جانے کا خطرہ یوں نہیں کہ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر کون رکھ سکتا ہے۔"

"مشکل یہ ہوئی ہے کہ وہ تصنیف و تالیف سے قطع تعلق بھی نہیں کر سکتا چوں کہ انھی "اوراقِ جمشیدی" کی مدد سے تو وہ اپنا "طلسم ہوش رُبا" سجائے ہوئے ہے۔" (۷۶)

"علمی اور تحقیقی کارنامے اس طرح وجود میں نہیں آتے کہ کاتا اور لے دوڑی۔" (۷۷)

رشید حسن خاں کے یہاں اس نوع کے فقروں اور جملوں کی اہمیت اساسی نہیں ہے۔ ہو بھی نہیں سکتی۔ اس لیے کہ ان کی زبان مجلسی اور صحافتی نہیں، وہ ایک محقق ہیں۔ اور ایک محقق کی طرح انداز بیان کی قطعیت کے قائل ہیں۔ وہ جس طرح مطالعہ میں "ارتکاز" کو ضروری خیال کرتے اسی طرح اپنی تحریروں میں بھی وہ ارتکاز پر زور دیتے ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنی نگارشات میں نظریاتی تنوع سے بھی اجتناب برتتے ہیں اور تنقیدی خیال آرائیوں سے بھی اب تقریباً دست کش ہو چکے ہیں۔

اردو زبان ۷۰ء کے بعد پچھلی ایک ثلث صدی میں جس ابتلائی دور سے گزری ہے اب وہ اس کی تاریخ کا ایک حصّہ بن چکا ہے اور اس کے اثرات کو مختلف شعبہ ہائے زندگی میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بایں ہمہ اس دور میں اردو تحقیق نے نمایاں حیثیت سے قدم آگے بڑھایا ہے۔ رشید حسن خاں نے تحقیق کے آداب اور اس کے ضابطوں کے بارے میں جو مضامین سپرد قلم کیے، ان میں معتبر غیر معتبر اور شکوک حوالوں کی بحث اٹھا کر اردو تحقیق میں ایک نئے فکر خیز باب کا اضافہ کیا ہے۔